ISSN: 3079-3319

Falcons Journal of Advanced Research

Volume: 04, Issue: (01), Article ID: FJAR-VOL4-01-26002A

Urdu Sketch Writing: From Character Depiction to Social Awareness (In the Contemporary Context)

اردو خاکہ نگاری: شخصیت نگاری سے معاشرتی شعور تک (عصرِ حاضر کے تناظر میں)

Zia Ullah Khan[1(*)], Muhammad Ejaz Qasim[2], Dr. Waseem Abbas Gul[3]

Abstract

This research article explores Urdu sketch writing as an important prose genre that extends beyond the description of an individual and reflects wider social, cultural, intellectual, and moral realities. While its early features may be traced in Ghalib's letters and Muhammad Hussain Azad's Aab-e-Hayat (1880), the formal beginning of the Urdu sketch is commonly linked with Mirza Farhatullah Baig's Nazir Ahmad Ki Kahani, Kuch Un Ki Kuch Apni Zabani (1927). Within a comparatively brief literary history, the genre achieved artistic refinement and thematic range through writers such as Mirza Farhatullah Baig, Maulvi Abdul Haq, Khwaja Hasan Nizami, Rasheed Ahmad Siddiqui, Saadat Hasan Manto, Malik Ram, Shahid Ahmad Dehlvi, Muhammad Tufail, Mujtaba Hussain, Mumtaz Mufti, and several others. The article explains that a sketch is neither a complete biography nor a formal introduction. It is a selective and creative portrayal of a personality, focusing on distinctive habits, appearance, strengths, weaknesses, inner tensions, and social environment. Through careful observation and expressive detail, the writer creates a vivid and memorable image of the subject. The genre is also not limited to celebrated figures; ordinary people, teachers, journalists, social workers, religious personalities, poets, and even symbolic subjects can become suitable material when presented with artistic sensitivity. Examples from major Urdu sketch writers show that the genre records more than personal impressions. It also preserves literary gatherings, educational practices, class attitudes, social relationships, linguistic concerns, and changing cultural values. In the modern age, when public identities are often shaped by media and artificial visibility, Urdu sketch writing remains relevant because it presents human personality with honesty, balance, sympathy, insight, and social understanding, for readers across different periods and social settings.

Keywords: *Urdu Sketch Writing, Personality Portrayal, Urdu Prose, Social Reflection, Biographical Sketch, Contemporary Urdu Literature*

Received: ***May 08, 2026*** *Accepted:* ***July 17, 2026***

How to Cite this Paper: Khan, Z. U., Qasim, M. E., & Gul, W. A. (2026). Urdu sketch writing: From character depiction to social awareness (In the contemporary context). *Falcons Journal of Advanced Research, 4*(1), 14-23. https://doi.org/10.63287/739830

[1] PhD Scholar, Department of Urdu, Ghazi University, Dera Ghazi Khan, ziaullahkhan8318@gmail.com (*Corresponding Author)
[2] PhD Scholar, Department of Urdu, The Islamia University of Bahawalpur, ejazqasim523@gmail.com
[3] Lecturer/SVC, Department of Urdu, Ghazi University, Dera Ghazi Khan, wagul@gudgk.edu.pk

© 2026 The Author(s). Published by Falcons Journal of Advanced Research (FJAR).
This is an open-access article distributed under the terms of the Creative Commons Attribution 4.0 International License (CC BY 4.0).

ISSN: 3079-3319
Volume: 4,
Issue:(01)
May 26 - Jul, 2026

اردو کی تخلیقی اصنافِ نثر میں خاکہ نگاری کو ایک منفرد مقام حاصل ہے، کیونکہ یہ صنف شخصیت نگاری، مشاہدے، تاثر، حقیقت بیانی اور ادبی حسن کو ایک ساتھ سمیٹتی ہے۔ اردو نثر میں اس کے ابتدائی نقوش مرزا غالب کے خطوط اور مولانا محمد حسین آزاد کے شعرائے اردو کے تذکرے "آب حیات" (1880ء) میں دیکھے جا سکتے ہیں، جہاں شخصیات کو محض ناموں اور واقعات کے طور پر نہیں بلکہ ان کے مزاج، انداز، علمی مقام اور عہد کے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ تاہم اردو میں خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ کے معروف خاکے "نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ اپنی زبانی" (1927ء) سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اردو خاکہ نگاری کی تاریخ سو سال سے کچھ کم بنتی ہے، لیکن اس مختصر عرصے میں جو خاکے لکھے گئے، وہ کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔ اردو کے اہم خاکہ نگاروں میں مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی عبد الحق، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی، مولانا عبد المجید سالک، عاشق حسین بٹالوی، چراغ حسن حسرت، شوکت تھانوی، اشرف صبوحی، شاہد احمد دہلوی، محمد طفیل، ڈاکٹر اسلم فرخی، مجتبیٰ حسین، ممتاز مفتی اور ڈاکٹر انوار احمد وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ ان خاکہ نگاروں نے شخصیت کو صرف تعریفی انداز میں بیان نہیں کیا بلکہ اس کے ظاہری خدوخال، باطنی کیفیات، سماجی تعلقات، فکری رجحانات اور عہد کے اثرات کو بھی اپنی تحریروں میں جگہ دی۔ اسی لیے اردو خاکہ نگاری کو محض شخصی تعارف یا یادداشت نہیں کہا جا سکتا، بلکہ یہ ایک ایسی ادبی صنف ہے جو فرد کے ذریعے معاشرتی زندگی کے کئی رنگ سامنے لاتی ہے۔

خاکہ دراصل انگریزی اصطلاح "Sketch" کا اردو ترجمہ ہے، جب کہ اس کے لیے انگریزی میں "Pen Portrait" کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے۔ اس اصطلاحی پس منظر سے واضح ہوتا ہے کہ خاکہ نگاری کا تعلق کسی شخصیت کی لفظی تصویر کشی سے ہے، مگر یہ تصویر محض ظاہری نہیں ہوتی بلکہ اس میں شخصیت کے نمایاں، منفرد اور اثر انگیز پہلو بھی شامل ہوتے ہیں۔ ایک اچھا خاکہ قاری کے ذہن میں اس طرح اترتا ہے کہ متعلقہ شخصیت صرف معلومات کا مجموعہ نہیں رہتی بلکہ ایک زندہ انسان کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی کے مطابق:

> "خاکہ ایک سوانحی مضمون ہے جس میں کسی شخصیت کے اہم اور منفرد پہلو اس طرح اجاگر کیے جاتے ہیں کہ اس شخصیت کی ایک جیتی جاگتی تصویر قاری کے ذہن میں پیدا ہو جاتی ہے۔"[1]

اس تعریف سے خاکہ نگاری کی بنیادی فنی حیثیت واضح ہوتی ہے۔ اس میں سوانح کا عنصر بھی موجود ہے، مگر یہ مکمل سوانح نہیں اس میں شخصیت کا بیان بھی ہے، مگر یہ محض تعارف نہیں اس میں مشاہدہ بھی ہے، مگر صرف ظاہری حلیہ نگاری نہیں۔ خاکہ نگار کسی شخصیت کے وہ پہلو منتخب کرتا ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز بناتے ہیں اور پھر انہیں اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ قاری اس شخصیت کو محسوس کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ خاکہ نگاری میں اختصار کے باوجود گہرائی، تاثر کے حقیقت، اور شخصی بیان کے باوجود معاشرتی معنویت موجود رہتی ہے۔ اس تحقیقی مضمون میں اردو خاکہ نگاری کو اسی تناظر میں دیکھا جائے گا کہ یہ صنف کس طرح شخصیت سے آغاز کر کے معاشرت تک پہنچتی ہے اور عصرِ حاضر میں اس کی ادبی و سماجی اہمیت کس طرح برقرار رہتی ہے۔

اردو خاکہ نگاری غیر افسانوی نثر کی وہ صنف ہے جس میں فرد کی شخصیت کو محض ظاہری تعارف یا واقعاتی معلومات کے طور پر نہیں بلکہ ایک زندہ، متحرک اور سماجی وجود کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ادب چونکہ انسانی زندگی کے تجربات، احساسات، رویّوں اور اجتماعی شعور سے تشکیل پاتا ہے، اس لیے خاکہ نگاری بھی صرف کسی ایک انسان کا بیان نہیں رہتی بلکہ اس کے ذریعے ایک مخصوص تہذیب، زمانہ، معاشرتی مزاج اور انسانی تعلقات کی کیفیت سامنے آتی ہے۔ کسی شخصیت کی عادات، گفتگو، لباس، نشست و برخاست، فکری رجحانات، اخلاقی کمزوریاں، سماجی تعلقات اور عملی کردار دراصل اس معاشرے کے اندر موجود اقدار کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جس میں وہ شخص زندگی گزارتا ہے۔ اسی لیے اردو خاکہ نگاری کو شخصیت سے معاشرت تک کے سفر کے طور پر سمجھنا زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ خاکہ نگار جب کسی فرد کو موضوع بناتا ہے تو وہ صرف یہ نہیں بتاتا کہ وہ شخص کون تھا، بلکہ یہ بھی دکھاتا ہے کہ وہ کس ماحول کا نمائندہ تھا، اس کی شخصیت میں اپنے عہد کے کون سے اثرات شامل تھے، اور اس کے کردار سے اجتماعی زندگی کے کون سے پہلو روشن ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خاکہ نگاری سوانح نگاری سے قریب ہوتے ہوئے بھی اس سے مختلف ہے، کیونکہ

سوانح عموماً زندگی کے واقعات کو زمانی ترتیب میں بیان کرتی ہے، جب کہ خاکہ کسی شخصیت کے تاثر، رنگ، مزاج اور اندرونی کیفیت کو گرفت میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری کی ابتدائی روایت تذکروں، روزناموں، خودنوشتوں اور سوانحی تحریروں سے جڑی ہوئی ہے، مگر جدید معنوں میں خاکہ اس وقت زیادہ واضح ہوا جب ادیبوں نے شخصیت کو محض نام، مقام اور کارناموں کے حوالے سے نہیں بلکہ انسانی خوبیوں اور کمزوریوں کے ساتھ پیش کرنا شروع کیا۔ محمد حسین آزاد کی "آب حیات" اس سلسلے میں ایک بنیادی حوالہ سمجھی جاتی ہے، کیونکہ اس میں شعرا کے احوال بیان کرتے ہوئے شخصیت کی متحرک تصویر بنانے کا شعور موجود ہے۔ آزاد نے اپنے مقصد کو یوں بیان کیا:

"اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چلتی، پھرتی تصویر میں سامنے آن کھڑی ہوں۔ اور انھیں حیات جاوداں حاصل ہو۔"[2]

اردو خاکہ نگاری کی فنی اہمیت اس بات میں ہے کہ یہ انسان کو نہ مکمل فرشتہ بنا کر پیش کرتی ہے اور نہ محض خامیوں کا مجموعہ سمجھتی ہے، بلکہ اس کی شخصیت کو خوبیوں، کمزوریوں، تضادات اور سماجی اثرات کے ساتھ دیکھتی ہے۔ یہی توازن ایک کامیاب خاکے کی بنیاد ہے۔ اگر خاکہ نگار صرف تعریف کرے تو تحریر عقیدت نامہ بن جاتی ہے، اور اگر صرف تنقید کرے تو خاکہ ذاتی رنجش کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ اصل خاکہ وہ ہے جس میں شخصیت کی سچائی برقرار رہے، مگر اس سچائی میں ادبی حسن، انسانی ہمدردی اور مشاہدے کی گہرائی بھی موجود ہو۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" اردو خاکہ نگاری میں اسی لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کہ انہوں نے اپنے استاد مولوی نذیر احمد کی شخصیت کو نہ صرف احترام کے ساتھ پیش کیا بلکہ ان کی کمزوریوں کو بھی چھپایا نہیں۔ ان کے نزدیک خاکہ نگاری کا مقصد کسی کو خوش کرنا یا کسی کی شخصیت کو مصنوعی عظمت دینا نہیں تھا، بلکہ اصل انسان کو قاری کے سامنے لانا تھا۔ وہ صاف لکھتے ہیں:

"جہاں مولوی صاحب کی خوبیاں دکھاؤں گا وہاں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کروں گا تاکہ مرحوم کی اصلی جیتی جاگتی تصویر کھینچ جائے اور یہ چند صفحات ایسی سوانح عمری میں نہ بن جائیں جو کسی کے خوش کرنے یا جلانے کے لیے لکھی گئی ہو۔"[3]

یہ پیراگراف اردو خاکہ نگاری کے بنیادی اصول کو نہایت واضح انداز میں سامنے لاتا ہے۔ اس میں شخصیت نگاری کے ساتھ حقیقت نگاری کا تقاضا بھی شامل ہے۔ فرحت اللہ بیگ کے ہاں خاکہ ایک ایسا ادبی عمل بن جاتا ہے جس میں یادداشت، مشاہدہ، محبت، تنقید اور سماجی شعور ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو خاکہ نگاری صرف فرد کی ظاہری یا اخلاقی تصویر نہیں بناتی بلکہ اس فرد کے ذریعے ایک پورے معاشرتی نظام کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ مولوی نذیر احمد کا خاکہ پڑھتے ہوئے قاری صرف ایک استاد یا ادیب کو نہیں دیکھتا، بلکہ اس عہد کی تعلیمی فضا، استاد شاگرد تعلق، علمی وقار، دینی و ادبی ماحول اور تہذیبی رویّوں کو بھی محسوس کرتا ہے۔ عصرِ حاضر کے تناظر میں یہی خصوصیت مزید اہم ہو جاتی ہے، کیونکہ آج شخصیتیں اکثر ظاہری شہرت، میڈیا کی تصویر اور فوری مقبولیت کے ذریعے پہچانی جاتی ہیں۔ ایسے عہد میں خاکہ نگاری انسان کو سطحی تصویر سے نکال کر اس کی اصل انسانی، فکری اور معاشرتی جہات کے ساتھ محفوظ کرنے کا کام کر سکتی ہے۔ اس لیے اردو خاکہ نگاری کا مطالعہ صرف ایک ادبی صنف کا مطالعہ نہیں، بلکہ شخصیت کے وسیلے سے معاشرے کو سمجھنے کی ایک بامعنی کوشش بھی ہے۔

اردو خاکہ نگاری کے ارتقائی مطالعے میں تذکروں، روزناموں اور یادداشتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہی وہ ابتدائی ادبی صورتیں ہیں جن کے اندر شخصیت نگاری کے وہ نقوش موجود تھے جو بعد میں باقاعدہ خاکہ نگاری کی شکل میں سامنے آئے۔ اگرچہ تذکرہ اپنی اصل میں شعرا، علما یا اہلِ فن کے تعارف، کلام، مقام اور مختصر حالات پر مشتمل ہوتا تھا، لیکن بعض تذکروں میں شخصیت کے انداز، مزاج، گفتگو، نشست، علمی وقار اور سماجی حیثیت کی جھلک بھی ملتی ہے۔ یہی جھلک آگے چل کر خاکے کی فنی بنیاد بن گئی۔ اردو میں خاکہ نگاری کو اگر مکمل طور پر مغربی اثرات کی دین سمجھ لیا جائے تو بات ادھوری رہتی ہے، کیونکہ ہماری اپنی ادبی روایت میں بھی انسان کو اس کے احوال، کلام، عادات اور حلقہ احباب کے ساتھ دیکھنے کا رجحان موجود تھا۔ ہاں، یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جدید خاکہ نگاری نے اس روایت کو زیادہ منظم، فنی اور ادبی

صورت دی۔ محمد حسین آزاد کی "آب حیات" اس حوالے سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ آزاد نے شعرا کے حالات بیان کرتے ہوئے صرف واقعاتی معلومات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کوشش کی کہ ہر شاعر اپنے مزاج، انداز اور ادبی ماحول سمیت سامنے آئے۔ یہی وجہ ہے کہ "آب حیات" کو صرف تذکرہ نہیں بلکہ اردو خاکہ نگاری کے ابتدائی شعور کا اہم ماخذ بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس روایت کو مرزا فرحت اللہ بیگ نے مزید واضح اور فنکارانہ انداز دیا۔ ان کی تحریر "دہلی کا یادگار مشاعرہ" میں شخصی خاکہ نگاری، تہذیبی منظر نگاری اور ادبی ماحول کی تصویر کشی ایک دوسرے میں گھل مل جاتی ہے۔ مومن خاں مومن کے شعر پڑھنے کے انداز کو بیان کرتے ہوئے وہ صرف ایک شاعر کا حلیہ یا حرکت بیان نہیں کرتے بلکہ ایک پوری مشاعراتی تہذیب کو زندہ کر دیتے ہیں۔ ان کا بیان دیکھیے:

> "انہوں نے شمع کو ذرا آگے رکھا، ذرا سنبھل کر بیٹھے باتوں باتوں میں انگلیوں سے کنگھی کی ٹوپی کو کچھ ترچھا کیا، آستینوں کو چنٹ کو صاف کیا اور بڑی درد انگیز آواز میں میں دل پذیر ترنم کے ساتھ غزل پڑھی شاعری کا جادو تھا تمام لوگ اک عالم محویت میں بیٹھے تھے وہ خود بھی اپنے کلام کا مزہ لے رہے تھے جس شعر میں ان کو زیادہ لطف آتا تھا اس کو پڑھتے وقت ان کی انگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں میں چلنے لگتی تھیں۔ بہت خوشی ہو تو زلفوں کو انگلیوں میں بل دے کر مروڑنے لگتے۔ کسی نے تعریف کی تو گردن جھکا کر ذرا مسکرا دیئے، پڑھنے کا طرز بھی سب سے جدا تھا ہاتھ بہت کم ہلاتے تھے اور ہلاتے بھی کیسے ہاتھوں کو بالوں سے فرصت کب تھی ہاں آواز کے زیر و بم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادو کر جاتے تھے غزل ختم ہوئی تو تمام شعرا نے تعریف کی مسکرائے اور کہا آپ لوگوں کی یہی عنایت ہو تو ہماری ساری محنت کا صلہ ہے۔"[4]

اس اقتباس میں محض مومن کی شخصیت نہیں ابھرتی بلکہ دہلی کی تہذیبی فضا، مشاعرے کا آداب، سامعین کی محویت، شاعر کا اندازِ ادا، اور اس دور کے ادبی ذوق کا نقشہ بھی سامنے آتا ہے۔ یہی خاکہ نگاری کی اصل خوبی ہے کہ وہ ایک فرد سے آغاز کرتی ہے مگر فرد کے ارد گرد پھیلے ہوئے پورے معاشرتی منظر کو بھی معنی دے دیتی ہے۔ اس طرح خاکہ نگاری شخصیت کی انفرادی تصویر کو تہذیبی اور سماجی دستاویز میں بدل دیتی ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعد اردو خاکہ نگاری کو فنی وقار عطا کرنے والوں میں مولوی عبد الحق کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے خاکہ نگاری کو محض دل چسپ نثر یا یادداشت کے درجے پر نہیں رہنے دیا بلکہ اسے شخصیت کے سنجیدہ، متوازن اور حقیقت پسندانہ مطالعے کا ذریعہ بنایا۔ مولوی عبد الحق کی کتاب "چند ہم عصر" اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس میں انہوں نے اپنے عہد کی علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی شخصیات کو نہ صرف ان کے کارناموں کے حوالے سے دیکھا بلکہ ان کی انسانی کمزوریوں، مزاجی تضادات اور باطنی کشمکش کو بھی نمایاں کیا۔ ان کے خاکوں میں عقیدت بھی ہے، مگر اندھی عقیدت نہیں؛ تنقید بھی ہے، مگر ذاتی حملہ نہیں؛ محبت بھی ہے، مگر شخصیت کو مصنوعی طور پر بلند کرنے کی کوشش نہیں۔ یہی توازن انہیں اردو خاکہ نگاری کا اہم نام بناتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر پر لکھتے ہوئے مولوی عبد الحق نے ان کی شخصیت کی عظمت کو بھی تسلیم کیا اور ان کے اندر موجود شدت، غصہ، تضاد اور غیر معمولی مزاج کو بھی چھپایا نہیں۔ ان کے الفاظ میں:

> "مولوی محمد علی مرحوم عجیب و غریب شخصیت لیے ہوئے ہیں وہ مختلف متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انھیں ایک آتش فشاں گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہو گا۔ ان دونوں میں عظمت و شان ہے۔ لیکن دونوں میں خطرہ و تباہی بھی موجود ہے، وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا پکا دشمن تھا۔ اگر اس کے ہاتھ میں کبھی اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر ہوتا وہ محبت و مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ دوست بھی اس کے جاں نثار اور فدائی تھے لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔"[5]

اس حوالے سے واضح ہوتا ہے کہ مولوی عبد الحق شخصیت کو یک رخا انداز میں پیش نہیں کرتے۔ وہ مولانا محمد علی جوہر کے سیاسی جذبے، آزادی پسندی، محبت،

مروت اور دوست نوازی کو بھی سامنے لاتے ہیں اور ساتھ ہی ان کی تند مزاجی، اقتدار کے ممکنہ خطرے اور مزاج کی شدت کو بھی بیان کرتے ہیں۔ یہی وہ انداز ہے جو خاکہ نگاری کو سوانحی مدح سرائی سے الگ کرتا ہے۔ یہاں شخصیت اپنی پوری انسانی پیچیدگی کے ساتھ موجود ہے۔ ایک طرف آزادی کا عاشق، جبر کا مخالف اور دوستوں پر جان نثار کرنے والا انسان ہے؛ دوسری طرف وہی انسان غصے، شدت اور تضاد کا پیکر بھی ہے۔ اس طرح مولوی عبدالحق کے ہاں خاکہ نگاری شخصیت کے اندر چھپی ہوئی معاشرتی اور نفسیاتی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے۔ عصرِ حاضر میں بھی یہی اصول اہم ہے، کیونکہ آج اکثر شخصیات کو یا تو مکمل ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا ہے یا مکمل طور پر رد کر دیا جاتا ہے۔ خاکہ نگاری اس انتہاپسندی کے مقابلے میں انسان کو اس کی اصل حالت میں دیکھنے کی تربیت دیتی ہے۔ یہ صنف ہمیں بتاتی ہے کہ معاشرہ بھی انسانوں کی طرح خوبیوں اور کمزوریوں کا مجموعہ ہے، اور کسی شخصیت کا متوازن مطالعہ دراصل معاشرتی شعور کو گہرا کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

اردو خاکہ نگاری کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس نے رفتہ رفتہ اپنی موضوعاتی حدوں کو وسیع کیا اور صرف مشہور، بااثر یا تاریخی شخصیات تک محدود نہیں رہی۔ ابتدا میں بلاشبہ زیادہ تر خاکے ادیبوں، شاعروں، علما، سیاست دانوں اور علمی و سماجی شخصیات پر لکھے گئے، کیونکہ ایسے افراد کے بارے میں لکھنے سے قاری کی دلچسپی بھی قائم رہتی تھی اور ایک عہد کی فکری فضا بھی سامنے آتی تھی۔ لیکن خاکہ نگاری کا اصل حسن اس وقت زیادہ نمایاں ہوتا ہے جب خاکہ نگار کسی عام انسان کے اندر چھپی ہوئی معنویت، کردار کی سادگی، محنت، وفاداری یا معاشرتی نمائندگی کو دریافت کرتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے "نام دیو مالی" کے ذریعے یہی ثابت کیا کہ خاکے کا موضوع صرف وہی شخص نہیں ہو سکتا جو تاریخ، سیاست یا ادب میں بڑا نام رکھتا ہو، بلکہ عام انسان بھی اپنے اندر ایک مکمل زندگی، تجربہ، احساس اور سماجی سچائی رکھتا ہے۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو خاکہ نگاری سماجی مساوات کے ایک نرم ادبی تصور کو بھی جنم دیتی ہے، کیونکہ یہ صنف انسان کو اس کے منصب، شہرت یا طبقے کے بجائے اس کے کردار، مزاج اور انسانی اثر کے حوالے سے دیکھتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں خاکہ نگاری شخصیت سے معاشرت کی طرف بڑھتی ہے۔ ایک مالی، ایک استاد، ایک صحافی، ایک شاعر، ایک سیاسی رہنما، ایک گھریلو عورت یا ایک خاموش سماجی کارکن، سب خاکہ نگاری کے موضوع بن سکتے ہیں، بشرطیکہ خاکہ نگار میں مشاہدے کی گہرائی اور زبان میں تصویر بنانے کی قوت موجود ہو۔ اسی فنی قوت کی ایک مثال پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے خاکوں میں ملتی ہے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ "چہرہ چہرہ داستان" اس اعتبار سے قابل ذکر ہے کہ اس میں شخصیت صرف نام یا تعارف بن کر نہیں آتی بلکہ اپنے جسمانی خدوخال، علمی وقار، باطنی کیفیت اور انسانی تاثر کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

عبدالماجد دریابادی کی شخصیت کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> "چند لمحے ہوئے ہوں گے چلمن کو جنبش ہوئی اور ماجد صاحب برآمد ہوئے دراز قد، چوڑا چکلا سینہ، سرخ و سفید رنگ، کسی قدر خمیدہ مگر بھرا ابھرا جسم، کتابی چہرہ، ستواں ناک، عبادت اور ریاضت سے پر نور دراز اور بھرپور داڑھی، روشن آنکھیں ہر بن منہ سے شادابی ٹپکتی، سفید کرتا، سفید پاجامہ، میں نے تصور میں ماجد صاحب کی جو تصویر بنائی تھی زیادہ فرق نہ نکلا گویا علم وادب میرے سامنے مجسم ہو۔"[6]

اس پیراگراف میں جسمانی نقشہ نگاری کے ساتھ ایک علمی اور روحانی تاثر بھی قائم ہوتا ہے۔ یہاں حلیہ صرف ظاہری بیان نہیں بلکہ شخصیت کے اندر موجود تہذیبی وقار، عبادت و ریاضت، علم دوستی اور اخلاقی سنجیدگی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ یہ انداز بتاتا ہے کہ خاکہ نگار اگر کسی شخصیت کو غور سے دیکھے تو چہرہ، لباس، آنکھیں، چال، نشست اور خاموشی تک معنی خیز بن جاتے ہیں۔ عصرِ حاضر میں بھی خاکہ نگاری کی یہی ضرورت باقی ہے کہ وہ انسان کو سطحی شہرت یا رسمی تعارف سے نکال کر اس کے مکمل انسانی پس منظر میں پیش کرے، تاکہ قاری صرف ایک فرد کو نہ دیکھے بلکہ اس فرد کے اندر اپنا عہد، معاشرہ اور تہذیبی مزاج بھی پہچان سکے۔

سعادت حسن منٹو نے اردو خاکہ نگاری کو ایک بالکل مختلف زاویہ دیا۔ ان کے ہاں شخصیت نگاری میں نہ رسمی عقیدت ہے، نہ اخلاقی پردہ پوشی، نہ وہ روایتی شائستگی جو اکثر شخصیات کو مرنے کے بعد بے داغ بنا کر پیش کرتی ہے۔ منٹو انسان کو اس کی اصل شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں، چاہے اس شکل میں کمزوری ہو، بدصورتی ہو، بے ترتیبی ہو، نفسیاتی پیچیدگی ہو یا معاشرتی منافقت کے خلاف احتجاج ہو۔ "گنجے فرشتے" کے دیباچے میں منٹو نے جس انداز سے اپنے خاکہ نگارانہ اصول کا اعلان کیا، وہ دراصل اردو خاکہ نگاری

ISSN: 3079-3319
Volume: 4,
Issue:(01)
May 26 - Jul, 2026

میں حقیقت پسندی، بے باکی اور انسانی سچائی کی ایک نئی روایت کی نشاندہی کرتا ہے۔ منٹو کے نزدیک کسی شخصیت کو ادبی طور پر زندہ رکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی تمام خامیوں کو دھو کر اسے رحمت، پاکیزگی اور عظمت کی مصنوعی کھونٹی پر ٹانگ دیا جائے۔ وہ اس رویے کے خلاف کھڑے ہوتے ہیں جو مرنے کے بعد ہر شخص کو معصوم، شریف اور بے عیب ثابت کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں :

> "میں ایسی دنیا پر، ایسے مہذب ملک پر، ایسے مہذب سماج پر ہزار لعنت بھیجتا ہوں جہاں یہ اصول مروج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کو کردار اور تشخص کی لانڈری میں بھیج دیا جائے۔ میرے اصلاح خانے میں جہاں سے وہ دھل کر آئے اور رحمۃ اللہ کی کھونٹی پر لگا دیا جائے۔ میرے اصلاح خانے میں کوئی گھنگھرو پیدا کرنے والی مشین نہیں۔ میں بناؤ سنگار کرنا نہیں جانتا آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہو سکتی۔ اس منہ سے گالیوں کے بجائے میں پھول نہیں جھڑا سکا۔ میراجی کی ذلت پر استری نہ ہو سکی اور میں اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکا ہوں کہ وہ غلط عورتوں کو صاحبہ کہیے۔ اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے اس کا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔"[7]

یہ اقتباس منٹو کے فنی مزاج کی مکمل نمائندگی کرتا ہے۔ وہ شخصیت کو بنا سنوار کر پیش کرنے کے بجائے اس کی پرتیں کھولتے ہیں، اور قاری کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ انسان کو اچھائی اور برائی کے سادہ خانوں میں تقسیم کرنے کے بجائے اس کی پیچیدہ حقیقت کو قبول کرے۔ منٹو کی خاکہ نگاری میں معاشرتی پہلو بھی بہت نمایاں ہے، کیونکہ وہ صرف کسی فرد کی خامیاں نہیں دکھاتے بلکہ اس معاشرے کی منافقت بھی بے نقاب کرتے ہیں جو زندہ انسان کو قبول نہیں کرتا مگر مرنے کے بعد اسے مقدس بنا دیتا ہے۔ عصر حاضر میں منٹو کا یہ رویہ مزید معنی رکھتا ہے، کیونکہ آج بھی شخصیات کو میڈیا، سیاست، ادب اور سماجی حلقوں میں یا تو غیر معمولی عظمت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے یا مکمل طور پر رد کر دیا جاتا ہے۔ منٹو کی خاکہ نگاری اس انتہا پسندی کے خلاف ایک ادبی مزاحمت ہے۔ وہ یاد دلاتے ہیں کہ انسان کو سمجھنا ہو تو اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریوں کو بھی دیکھنا پڑے گا، ورنہ خاکہ نگاری سچائی کے بجائے نمائشی اخلاقیات کا حصہ بن جائے گی۔

اردو خاکہ نگاری میں ظاہری نقشہ نگاری صرف حلیہ بیان کرنے کا نام نہیں بلکہ شخصیت کے باطنی تاثر تک پہنچنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ ایک اچھا خاکہ نگار کسی شخص کے چہرے، آنکھوں، لباس، چال، بیٹھنے کے انداز، بات کرنے کے طریقے اور معمولی حرکات میں بھی معنی تلاش کرتا ہے۔ بظاہر یہ سب چیزیں چھوٹی معلوم ہوتی ہیں، مگر انہی سے شخصیت کا وہ مجموعی تاثر بنتا ہے جو قاری کے ذہن میں دیر تک قائم رہتا ہے۔ مالک رام کی خاکہ نگاری اسی پہلو سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے مجموعے "وہ صورتیں الٰہی" میں شخصیتوں کی تصویر کشی صرف معلوماتی انداز میں نہیں کی گئی بلکہ اس میں مشاہدے کی باریکی، زبان کی روانی اور تصویر بنانے کی غیر معمولی صلاحیت موجود ہے۔ جگر مراد آبادی کا خاکہ اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہے، کیونکہ مالک رام نے ان کی ظاہری صورت کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ قاری کے سامنے ایک چلتی پھرتی شخصیت ابھر آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "میانہ قد، خاصا سانولا رنگ، چپٹی ناک، چھوٹی چھوٹی نیم وا آنکھیں اور ان میں سرخی کی جھلک، ہونٹوں پر پان کا لاکھا جما ہوا، ترشی ہوئی کھچڑی داڑھی، جس میں چاول کم اور دال زیادہ تھی۔ سر پر لیے لیے ترتیب پچھے جو ٹوپی سے باہر نکلے پڑتے تھے۔ گلے میں سیاہ رنگ کی شیروانی اور نیچے چوڑی دار چست پاجامہ، سر پر سلیٹی رنگ کی بالوں والی اونچی دیوار کی ٹوپی اور پاؤں میں سیاہ رنگ کا پمپ پہنتے تھے۔ طبیعت میں حد درجہ بے چینی اور وحشت حالانکہ وہ صرف چند منٹ کے لیے رکے، لیکن اس دوران میں بھی انھوں نے جو باتیں کیں کچھ عجیب اکھڑی اکھڑی سی یوں معلوم ہوتا تھا گویا اپنے سائے سے بھڑک رہے ہوں یہ تھے جگر صاحب۔"[8]

مالک رام نے جگر کی شخصیت کو کسی رسمی تعارف کے بجائے ایک زندہ منظر کے طور پر پیش کیا ہے۔ چہرے کا رنگ، ناک کی بناوٹ، آنکھوں کی کیفیت، پان کا رنگ، داڑھی کی ترکیب، شیروانی، پاجامہ، ٹوپی اور جوتے تک سب تفصیل سے بیان ہوئے ہیں، مگر یہ تفصیل بے مقصد نہیں۔ اس کے آخر میں "طبیعت میں حد درجہ بے چینی

ISSN: 3079-3319
Volume: 4,
Issue:(01)
May 26 - Jul, 2026

اور وحشت" کا ذکر آتا ہے تو ظاہری نقشہ اچانک باطنی کیفیت سے جڑ جاتا ہے۔ یہاں حلیہ شخصیت کی نفسیات تک لے جاتا ہے۔ جگر کی اکھڑی اکھڑی باتیں اور اپنے ہی سائے سے بھڑکنے کا تاثر ان کی اندرونی بے قراری کو ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح خاکہ نگاری صرف جسمانی تصویر نہیں بناتی بلکہ فرد کی ذہنی کیفیت اور اس کے سماجی تاثر کو بھی سامنے لاتی ہے۔ عصر حاضر میں جب ظاہری تصویر اکثر مصنوعی بناوٹ اور نمائشی انداز کے ساتھ پیش کی جاتی ہے، مالک رام کا یہ انداز یاد دلاتا ہے کہ حقیقی خاکہ نگاری ظاہری تفصیل کو باطنی صداقت سے جوڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک کامیاب خاکہ پڑھنے کے بعد قاری صرف کسی شخص کا چہرہ نہیں دیکھتا بلکہ اس کے مزاج، اضطراب، تہذیبی پس منظر اور زندگی کے دباؤ کو بھی محسوس کرتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے اردو خاکہ نگاری کی ابتدائی روایت کو سمجھنے کے لیے نہایت اہم ہیں، کیونکہ ان تحریروں میں باقاعدہ خاکہ نگاری کا دعویٰ کم ہے مگر شخصیت نگاری کے واضح نقوش بہت نمایاں ہیں۔ روزنامچہ عام طور پر روزمرہ واقعات، ملاقاتوں، تاثرات اور مشاہدات کا بیان ہوتا ہے، لیکن جب لکھنے والے کی نظر باریک، زبان بامعنی اور انسانوں سے دلچسپی گہری ہو تو یہی روزمرہ تحریر خاکہ نگاری کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے ہاں یہی کیفیت ملتی ہے۔ وہ جن لوگوں سے ملتے ہیں، ان کے بارے میں صرف یہ نہیں بتاتے کہ ملاقات ہوئی، بلکہ ان کے انداز، مقام، عمر، ظاہری تبدیلی، سماجی حیثیت اور لوگوں میں مقبولیت کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اس طرح ایک مختصر سا روزنامچہ بھی شخصیت اور معاشرت دونوں کا ریکارڈ بن جاتا ہے۔ مولانا اسرار الحق کے بارے میں ان کا بیان دیکھیے:

> "طوطی ہند: مولانا اسرار الحق صاحب طوطی ہند سے بھی دعوت میں
> ملاقات ہوئی۔ سالہا سال کے بعد ملے خوب معانقہ ہوا۔ میرے پرانے
> ملنے والے ہیں۔ آج کل رہتک میں رہتے ہیں۔ ان کا وعظ اور ان کی تقریر
> اور ان کا لحن بہت مقبول ہے اور مسلمان ان کو طوطی ہند کہتے ہیں۔ نہایت
> گورے چٹے خوبصورت عالم ہیں۔ آج میں نے دیکھا بال سفید ہو گئے ہیں۔
> بوڑھے معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں۔"[9]

یہ اقتباس بظاہر ایک مختصر ملاقات کا بیان ہے، مگر اس میں خاکہ نگاری کے کئی بنیادی عناصر موجود ہیں۔ سب سے پہلے "طوطی ہند" کا لقب سامنے آتا ہے جو مولانا اسرار الحق کی خطابت، آواز اور عوامی مقبولیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پھر ان کے رہنے کا مقام، پرانی شناسائی، وعظ و تقریر کی مقبولیت، ظاہری حسن، بالوں کی سفیدی اور عمر کے مقابلے میں بڑھاپے کا تاثر، سب ایک ساتھ آتے ہیں۔ یہ چند جملے مولانا کی مکمل سوانح نہیں بناتے، لیکن ان کی شخصیت کا ایک تاثر ضرور قائم کر دیتے ہیں۔ یہی خاکہ نگاری کا ابتدائی جوہر ہے کہ کم الفاظ میں شخصیت کی ایسی تصویر بن جائے جس میں ظاہری صورت، سماجی مقام اور زمانے کی تبدیلی ایک ساتھ محسوس ہو۔ خواجہ حسن نظامی کے روزنامچوں کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ ان میں ادبی یا سیاسی شخصیات کے ساتھ ساتھ روزمرہ ملنے جلنے والے افراد، مذہبی رہنما، قومی درد رکھنے والے لوگ اور سماجی کردار بھی آتے ہیں۔ اس سے خاکہ نگاری کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شخصیت کو سمجھنے کے لیے صرف بڑی کتابیں یا طویل سوانح ضروری نہیں، بلکہ ایک حساس مشاہدہ بھی کافی ہو سکتا ہے۔ عصر حاضر میں بھی اگر روزمرہ زندگی، ملاقاتوں، یادداشتوں اور مشاہدات کو اسی سنجیدگی سے لکھا جائے تو اردو خاکہ نگاری نئی معاشرتی جہتیں اختیار کر سکتی ہے، کیونکہ ہمارے عہد کے انسانوں کی اصل تصویر اکثر انہی چھوٹی ملاقاتوں اور بظاہر معمولی اشاروں میں محفوظ ہوتی ہے۔

خواجہ حسن نظامی کے روزنامچوں میں خاکہ نگاری کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ وہ شخصیت کو صرف ادبی یا علمی عظمت کے حوالے سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کی سماجی وابستگی، قومی احساس، زبان سے محبت اور روزمرہ زندگی کے عملی کردار کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں خاکہ نگاری کا دائرہ محض مشہور ناموں تک محدود نہیں رہتا بلکہ ایسے افراد بھی سامنے آتے ہیں جو اپنے مخصوص کام، خلوص یا معاشرتی خدمت کی وجہ سے قابلِ ذکر بن جاتے ہیں۔ عبد الرزاق نظامی کا ذکر اسی نوعیت کی مثال ہے۔ یہاں کوئی طویل سوانحی بیان نہیں، نہ شخصیت کو غیر معمولی بنانے کی کوشش ہے، مگر چند مختصر جملوں میں ایک ایسا انسان سامنے آتا ہے جس کے اندر قوم اور اردو زبان کے لیے درد موجود ہے۔ خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں:

ISSN: 3079-3319
Volume: 4,
Issue:(01)
May 26 - Jul, 2026

"عبد الرزاق نظامی: فیض آبادی کے دل میں قوم اور اردو زبان کا بہت درد تھا۔ اور وہ یہ کام محض اخباروں کی امداد کے لیے کرتے ہیں۔ دبلا بدن، میانہ قد ہے، چالیس کے قریب عمر ہے۔ میرے پرانے مریدوں میں ہیں۔ ان کا ذریعہ معاش اخبار فروشی نہیں ہے۔ بلکہ کسی جگہ نوکر ہیں اور فرصت کے وقت اخبار کا کام بھی کرتے ہیں۔"[10]

اس اقتباس میں خاکہ نگاری کے کئی اجزا ایک ساتھ موجود ہیں۔ سب سے پہلے عبد الرزاق نظامی کی فکری اور قومی وابستگی بیان ہوتی ہے کہ ان کے دل میں قوم اور اردو زبان کا درد تھا۔ پھر ان کے کام کی نوعیت سامنے آتی ہے کہ وہ اخباروں کی امداد کے لیے یہ کام کرتے تھے۔ اس کے بعد جسمانی خدوخال کا مختصر بیان ہے، یعنی دبلا بدن، میانہ قد اور چالیس کے قریب عمر۔ آخر میں ان کے معاشی پس منظر کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ اخبار فروشی ان کا اصل ذریعہ معاش نہیں بلکہ وہ کہیں ملازم تھے اور فرصت کے اوقات میں اخبار کا کام بھی کرتے تھے۔ یہ مختصر خاکہ دراصل ایک ایسے طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو رسمی شہرت نہیں رکھتا مگر معاشرے کی علمی، لسانی اور قومی زندگی میں خاموش کردار ادا کرتا ہے۔ یہاں شخصیت کے ذریعے معاشرت کا ایک اہم پہلو سامنے آتا ہے: اردو زبان کے ساتھ وابستگی، اخبار کے ذریعے رائے عامہ کی تشکیل، محدود وسائل کے باوجود قومی کام میں حصہ لینا، اور ملازمت کے ساتھ ادبی و صحافتی خدمت کو جاری رکھنا۔ اس طرح خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے صرف ذاتی ملاقاتوں کا ریکارڈ نہیں بلکہ اپنے زمانے کی معاشرتی ساخت، زبان دوستی، طبقاتی حالات اور فکری سرگرمیوں کا ادبی بیان بھی ہیں۔ عصر حاضر میں جب صحافت، زبان، قومی شناخت اور سماجی خدمت کے معانی تیزی سے بدل رہے ہیں، ایسے خاکوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، کیونکہ یہ ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ معاشرتی زندگی صرف بڑے اداروں، مشہور شخصیات یا طاقت ور طبقات سے نہیں بنتی بلکہ ایسے عام مگر مخلص افراد سے بھی بنتی ہے جو پس منظر میں رہ کر زبان، فکر اور سماج کی خدمت کرتے ہیں۔ اردو خاکہ نگاری کی یہی وسعت اسے ایک انسانی اور معاشرتی صنف بناتی ہے۔

خاکہ نگاری کی روایت میں خواجہ حسن نظامی کا ایک منفرد پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے صرف مرئی انسانی شخصیات تک خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ غیر مرئی اور تجریدی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔ یہ بات بظاہر حیران کر سکتی ہے، کیونکہ خاکہ عام طور پر کسی انسان کے ظاہری و باطنی خدوخال کی تصویر کشی کا نام سمجھا جاتا ہے، مگر خواجہ حسن نظامی نے اس تصور کو وسیع کرتے ہوئے اللہ میاں، فرشتے، شیطان، گناہ، ملاوٹ، مہنگائی اور دیگر غیر محسوس یا غیر انسانی موضوعات کو بھی خاکے کے دائرے میں لانے کی کوشش کی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک خاکہ نگاری محض چہرہ نگاری نہیں بلکہ تصور، احساس، عقیدہ، سماجی کیفیت اور فکری تجربے کو ادبی شکل دینے کا نام بھی ہے۔ اللہ میاں کے خاکے میں وہ ایک ایسے موضوع کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں جسے ظاہری صورت میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا بیان ملاحظہ ہو:

"بے صورت کی ایک مورت، تارہ بھی نہیں، چاند بھی نہیں، سورج بھی نہیں ہفت افلاک بھی نہیں، عرش و کرسی بھی نہیں، سمندر اور پہاڑ بھی نہیں، بہتا ہوا دریا بھی نہیں، ششدر اور حیران کنارہ بھی نہیں، کوندنے والی بجلی بھی نہیں، گرجنے والا بادل بھی نہیں، جمادات بھی نہیں، نباتات بھی نہیں، انسان بھی نہیں، وہ تو بس بے صورت کی ایک صورت ہے۔ کیا وہ لیلی کے چہرے کا حسن ہے؟ کیا وہ مجنوں کا آہ و بکا ہے؟ کیا وہ شیریں کی میٹھی بات ہے؟ سب صورتیں اس کی سب چلیے اس کے، سب چہرے اس کے، سب جلوے اس کے، سب روشنیاں اس کی، سب نور اس کے، سب اندھیرے اس کے، سب سیرتیں اس کی قاتل و مقتول، جاہل، مجہول، عالم و معلوم، خطاوار اور بے خطا، خوبصورت و بدصورت کالا اور گورا، ادنی اور اعلیٰ اندھیرا اور اجالا، سب اسے نظر نہ آنے والے مگر ہر ایک کا منظور نظر کا سراپا اور حلیہ ہے۔"[11]

اس پیراگراف میں خواجہ حسن نظامی ایک ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جو صورت اور بے صورتی، ظاہر اور باطن، روشنی اور اندھیرے، حسن اور حیرت، معلوم اور نامعلوم کے درمیان حرکت کرتی ہے۔ یہاں خاکہ کسی انسانی چہرے کا نہیں بلکہ ایک ایسے تصور کا ہے جو ہر صورت میں موجود بھی ہے اور کسی ایک صورت میں محدود بھی نہیں۔ فنی اعتبار سے یہ تجربہ خاکہ نگاری کے امکانات کو وسیع کرتا ہے، کیونکہ اس میں پیکر تراشی ظاہری مشاہدے کے بجائے تخیل، عقیدت، علامت اور زبان کے ذریعے ہوتی ہے۔ معاشرتی اعتبار سے بھی یہ تحریر اہم ہے، کیونکہ اس سے معلوم ہوتا

ہے کہ اردو نثر میں مذہبی، روحانی اور فکری تصورات کو بھی شخصی انداز میں بیان کرنے کی صلاحیت موجود رہی ہے۔ البتہ اس نوع کی خاکہ نگاری میں احتیاط کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ مقدس یا غیر مرئی موضوعات پر لکھتے ہوئے زبان کی تہذیب، فکری ذمہ داری اور ادبی وقار برقرار رکھنا ضروری ہے۔ خواجہ حسن نظامی کا یہ تجربہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ خاکہ نگاری صرف انسان کی جسمانی تصویر تک محدود نہیں، بلکہ اگر فنکار کے پاس مناسب زبان، تخیل اور مشاہدہ ہو تو وہ کسی تصور، کیفیت یا معاشرتی مسئلے کو بھی ایک ادبی پیکر دے سکتا ہے۔ عصر حاضر میں یہ پہلو خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ آج معاشرہ صرف افراد سے نہیں بلکہ تصورات، نظریات، میڈیا امیجز، اجتماعی خوف، خواہشات اور شناختی بحرانوں سے بھی تشکیل پا رہا ہے۔ جدید خاکہ نگاری اگر ان غیر مرئی عناصر کو گرفت میں لے سکے تو یہ صنف مزید وسعت اختیار کر سکتی ہے۔

اردو خاکہ نگاری کی مجموعی روایت کو دیکھا جائے تو یہ بات نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ یہ صنف اپنے اندر وسعت بھی رکھتی ہے اور اختصار بھی۔ اس کا دائرہ اگرچہ مختصر نثر کا ہے، مگر اس کے اندر انسان، معاشرہ، تہذیب، نفسیات، تاریخ، یادداشت اور زبان کے کئی رنگ جمع ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خاکہ نگاری کو صرف کسی شخصیت کے ظاہری تعارف یا مختصر حالات کا بیان سمجھنا درست نہیں۔ ایک کامیاب خاکہ وہ ہے جو کم لفظوں میں ایک مکمل انسانی تاثر قائم کر دے، اور قاری کو یہ محسوس ہو کہ وہ صرف کسی شخص کے بارے میں پڑھ نہیں رہا بلکہ اس سے مل رہا ہے۔ اردو نثر کی غیر افسانوی اصناف میں خاکہ نگاری نے اسی وجہ سے اپنی مستقل حیثیت بنائی۔ اس کے اندر سوانح کی معلوماتی سنجیدگی بھی آ سکتی ہے، یادداشت کی شخصی قربت بھی، تذکرے کی تاریخی جھلک بھی، اور افسانوی نثر کی تصویری قوت بھی۔ لیکن اس کے باوجود خاکہ اپنی جداگانہ شناخت رکھتا ہے، کیونکہ اس کا مقصد نہ مکمل سوانح لکھنا ہے، نہ محض تاریخی تذکرہ کرنا، بلکہ شخصیت کے ایسے نمایاں نقوش پیش کرنا ہے جو اس کے پورے وجود کا تاثر قائم کر دیں۔

عصر حاضر کے تناظر میں اردو خاکہ نگاری کی معنویت اس لیے بھی برقرار ہے کہ موجودہ معاشرہ تیز رفتار تبدیلیوں، مصنوعی شخصی تصویروں، طبقاتی دباؤ، شناختی مسائل، زبان کی بدلتی ہوئی صورتوں اور سماجی روابط کی نئی شکلوں سے گزر رہا ہے۔ ایسے ماحول میں انسان کو سمجھنے کے لیے صرف اعداد و شمار، رسمی تعارف یا تاریخی معلومات کافی نہیں رہتیں۔ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ فرد کے اندر موجود انسانی پیچیدگی، سماجی دباؤ، اخلاقی رویّہ، فکری سمت اور تہذیبی تعلق کو دیکھا جائے۔ خاکہ نگاری یہ کام نہایت مؤثر انداز میں کر سکتی ہے، کیونکہ یہ شخصیت کو ایک زندہ تجربے کے طور پر سامنے لاتی ہے۔ ماضی کی اردو خاکہ نگاری نے یہ ثابت کیا کہ ایک شخص کا چہرہ، گفتگو، لباس، عادت، خاموشی، غصہ، محبت، مزاح، علمی وقار یا معاشرتی درد، سب ادبی معنی رکھتے ہیں۔ اس کے ذریعے نہ صرف فرد کی تصویر بنتی ہے بلکہ اس فرد کے عہد کا مزاج بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اردو خاکہ نگاری کو شخصیت سے معاشرت تک کا سفر کہا جا سکتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں کہ:

> "خاکہ نگاری نے جس تیزی کے ساتھ ترقی کے منازل طے کیے ہیں اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا مستقبل بہت کامیاب اور تابناک ہے۔ خاکہ نگاری اردو ادب کی مختصر سہی لیکن اہم صنف ہے اگر اس کے فنی لوازمات کے ساتھ اس کو برتا جائے تو اس کے فن کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔"[12]

یہ حوالہ خاکہ نگاری کے بارے میں ایک مثبت ادبی امکان کو سامنے لاتا ہے۔ اس میں یہ بات واضح ہے کہ خاکہ نگاری اگر اپنے فنی تقاضوں کے ساتھ لکھی جائے تو اس کی اہمیت ختم نہیں ہوتی بلکہ وقت کے ساتھ بڑھ سکتی ہے۔ فنی تقاضوں سے مراد محض اچھی زبان نہیں، بلکہ گہرا مشاہدہ، حقیقت پسندی، توازن، انسانی ہمدردی، باطنی نظر، معاشرتی شعور اور بیان کی تصویری قوت ہے۔ جدید دور میں خاکہ نگاری کو صرف ادبی شخصیات تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ اس میں عام انسان، عورتیں، محنت کش طبقہ، استاد، صحافی، سماجی کارکن، طالب علم، ہجرت کا تجربہ رکھنے والے افراد، اور ڈیجیٹل عہد کی نئی شخصیات بھی شامل ہونی چاہئیں۔ اس طرح یہ صنف اپنے زمانے کا زیادہ مکمل ریکارڈ بن سکتی ہے۔ اردو خاکہ نگاری کی اصل کامیابی اسی میں ہے کہ وہ انسان کو نہ بے عیب بنائے، نہ بے معنی؛ نہ اسے محض واقعات کا مجموعہ سمجھے، نہ صرف ظاہری صورت تک محدود کرے۔ ایک اچھا خاکہ انسان کو اس کی پوری انسانی سچائی کے ساتھ پیش کرتا ہے، اور یہی سچائی آخرکار معاشرے کی سچائی بن جاتی ہے۔ اس اعتبار سے اردو خاکہ

ISSN: 3079-3319
Volume: 4,
Issue:(01)
May 26 - Jul, 2026

نگاری آج بھی ایک بامعنی، زندہ اور قابلِ توجہ صنف ہے، بشرطیکہ اسے سنجیدگی، فنی شعور اور عصری احساس کے ساتھ برتا جائے۔

حوالہ جات

1. ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشافِ تنقیدی اصطلاحات، طبع دوم (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1985ء)، 72۔
2. محمد حسین آزاد، آبِ حیات (لاہور: نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس، 1907ء)، 4۔
3. مرزا فرحت اللہ بیگ، ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی ،(دہلی: آزاد کتاب گھر، 1962ء)، ص 6۔
4. 4 مرزا فرحت اللہ بیگ، دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ ،(لاہور: ادبی لائبریری، 1968ء)، ص 271۔
5. 5 مولوی عبدالحق، چند ہم عصر، (دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 1942ء)، ص 135۔
6. 6 سلیمان اطہر جاوید، چہرہ چہرہ داستان، (حیدرآباد، انڈیا: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، 1977ء)، ص 98۔
7. 7 سعادت حسن منٹو،" دیباچہ"، گنجے فرشتے، (لاہور: مکتبہ جدید، 1952ء)۔
8. مالک رام، وہ صورتیں الٰہی، (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1976ء)، ص 371۔
9. ماہنامہ منادی، نئی دہلی، جلد 44، شمارہ 7 (نئی دہلی: منادی، 1969ء)، ص 14۔
10. ماہنامہ منادی، نئی دہلی، جلد 42، شمارہ 11 (نئی دہلی: منادی، نومبر 1967ء)، ص 17۔
11. ابوسلمان شاہجہاں پوری، خواجہ حسن نظامی: خاکے اور خاکہ نگاری، (اسلام آباد: پورب اکادمی، 2007ء)، ص 101۔
12. ایضاً، ص 102۔

References (English Translation)

Abul Ijaz Hafeez Siddiqui, Kashshaf-e-Tanqidi Istilahat [Dictionary of Critical Terms], 2nd ed. (Islamabad: Muqtadara Qaumi Zaban, 1985), 72.

Muhammad Husain Azad, Aab-e-Hayat [The Water of Life] (Lahore: Nawal Kishore Gas Printing Works, 1907), 4.

Mirza Farhatullah Baig, Dr. Nazir Ahmad Ki Kahani: Kuch Meri Aur Kuch Un Ki Zabani [The Story of Dr. Nazir Ahmad: Partly in My Words and Partly in His Own] (Delhi: Azad Kitab Ghar, 1962), 6.

Mirza Farhatullah Baig, Delhi Ka Ek Yadgar Mushaira [A Memorable Poetry Gathering of Delhi] (Lahore: Adabi Library, 1968), 271.

Maulvi Abdul Haq, Chand Hum Asr [Some Contemporaries] (Delhi: Anjuman Taraqqi Urdu Hind, 1942), 135.

Sulaiman Athar Javed, Chehra Chehra Dastan [Every Face Tells a Story] (Hyderabad, India: National Fine Printing Press, 1977), 98.

Saadat Hasan Manto, “Preface,” in Ganjay Farishtay [Bald Angels] (Lahore: Maktaba Jadid, 1952).

Malik Ram, Woh Suratein Ilahi [Those Divine Faces] (New Delhi: Maktaba Jamia Limited, 1976), 371.

Monthly Munadi, New Delhi, vol. 44, no. 7 (New Delhi: Munadi, 1969), 14.

Monthly Munadi, New Delhi, vol. 42, no. 11 (New Delhi: Munadi, November 1967), 17.

Abu Salman Shahjahanpuri, Khwaja Hasan Nizami: Khakay Aur Khaka Nigari [Khwaja Hasan Nizami: Sketches and the Art of Sketch Writing] (Islamabad: Purab Academy, 2007), 101.

Ibid., 102.